پروفیسر انور رومان
مترجم: پروفیسر انعام الحق کوثر

براہوئی تاریخ

براہوئی تاریخ قلات ریاست کے اردگرد گھومتی ہے۔ جس نے یہ صورت اس وقت اختیار کرنی شروع کی جب دہلی کے سلاطین کمزور ہو گئے تھے۔ اس کے ظہور کی مطابقت ایران میں صفویوں کے بالمقابل ہے جنھوں نے ایک پہلو سے فرقہ وارانہ قومی حکومت قائم کی۔ اس کے بعد مغلوں نے ہند و پاکستان میں وسیع پیمانے پر زیادہ آزادانہ تجربہ کیا۔ براہوئی ریاست نے علاقائیت سے تحریک پائی جو قومیت کے ارتقا کے لیے ایک ابتدائی منزل ہے۔

اس کی ابتدائی تاریخ ۱۶۶۶ء میں میر احمد خاں اوّل کی تخت نشینی کے وقت تک گھناؤنی تصویر پیش کرتی ہے۔ یہ روایات کی بھرمار اور عام لوگوں میں راسخ شدہ متداول عقائد کا مجموعہ ہے جس میں چھان بین نہیں کی گئی، اور اسے تاریخی صحت یا کم از کم تاریخ سے مشابہت کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ میر گل خاں نصیر زگر مینگل نے جو سابقہ بلوچستان کا ایک صحافی، شاعر اور سیاسی کارکن ہے تاریخ بلوچستان دو حصّوں میں شائع کی (۱۹۵۷-۱۹۵۲ء)۔ اگرچہ کتاب ہزار صفحات پر مشتمل ہے تاہم توقعات سے بہت دُور ہے۔ یورپ کے چند ضعیف البصر تاریخ دانوں کی طرح جن کے خیال میں دنیا محض یورپ ہی کی توسیع ہے، نصیر نے ریاست قلات کو ہی مکمل بلوچستان سمجھ لیا اور دیگر اہم علاقوں اور طبقوں کے بارے میں چشم پوشی سے کام لیا۔ کتاب کا زیادہ موزوں عنوان 'تاریخ قلات' ہونا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے آپ کو محض سیاسی حالات بیان کرنے اور بعض خاص شخصیتوں کو از سرِ نو متعارف کرانے تک محدود رکھا۔ اس سلسلہ میں معاشی، سماجی اور نظری پس منظر کو پیشِ نظر نہیں رکھا۔ بلکہ اپنی کتاب کو محض بادشاہوں، اُن کے درباروں، اور فتوحات کے حالات تک محدود

کر دیا اور ماحول کو جو تاریخ کی حرکی قوت ہے پس پشت ڈال دیا۔ اس میں شخصیتوں کو زیادہ نمایاں کرنے کی طرف رجحان پایا جاتا ہے۔ اس کی داخلیت مقامی نقطۂ نظر کے ساتھ بہت زیادہ ہم آہنگ ہے۔ اُس نے پٹھانوں کو نظر انداز کر دیا اور بلوچوں کو ثانوی حیثیت دی۔ سب سے اخیر میں کتاب مستند تاریخی دستاویزات سے مزین نہیں کی گئی۔ بہر حال اس خطّہ میں اردو میں تاریخ نویسی کی یہ دوسری کوشش ہے اور جو کچھ نصیر نے لکھا ہے اس میں تغیر اور اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس نے نصیر خاں اوّل کے حالات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اس علاقے کی مسلسل اور حقیقی تاریخ رقم کرنے کے لیے تحقیقی کام کی ضرورت ہے اور جب وہ مکمل ہو جائے تو نتائج کو تاریخی واقعات خاص کر ایران اور ہند و پاکستان کی تاریخ اور عام تاریخی ارتقار کے پہلو بہ پہلو رکھ کر پرکھنا چاہیے۔ میر نصیر کو بعض رکاوٹوں کے تحت کام کرنا پڑا۔ چنانچہ اس کی کتاب میں کچھ تاریخی غلطیاں بھی ہیں[۱]۔

دوسری کتاب 'بلوچستان' ملک صالح محمد لہڑی نے ۱۹۵۵ء میں لکھی اور شائع کی۔ یہ پہلی کتاب کے مقابلہ میں رو بہ اصلاح ہے۔ اس میں مستند شواہد بھی موجود ہیں۔ براہویوں اور بلوچوں کا یکساں جائزہ لیا گیا ہے اور پٹھانوں کا ذکر بھی گاہے بگاہے ملتا ہے۔ مصنّف کا مطمحِ نظر وسیع تر ہے اور اس نے پاکستان کے وسیع دائرہ میں اس خطّہ کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ بھی نامکمل ہے اور مشتاق طالب علم تشنگی محسوس کرتا ہے۔ مثلاً میر نصیر خاں اوّل (۱۷۵۰-۹۴ء) کے حالات جو سب سے بڑا براہوئی حکمران ہے محض پانچ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس کے بالمقابل تاریخِ بلوچستان، میں تقریباً ۸۱ صفحات اس عظیم شخصیت کے لیے وقف کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں دونوں مصنّف خاص کر ہتو رام اور امپیریل گزیٹیئرز آف انڈیا میں سے اقتباسات اور ترجمہ کرنے کے بارے

۱۔ مثلاً حجاج بن یوسف کو خلیفہ کہا ہے (صفحہ ۱۳)، منگول لشکر کی پیش قدمی کا ہند میں آغاز پندرھویں صدی میں ہوا (صفحہ ۱۶)، میر حسن، شاہجہاں اور بابر کے بیٹے میرزا کامران کا ہم عصر تھا (صفحات ۲۱، ۳۳) اشرف شاہ خلجی کا قتل میر عبداللہ خاں کے ہاتھوں ہوا (صفحہ ۶۱، حصہ اوّل)۔

میں قدرے بے باک ثابت ہوئے ہیں لیکن ماخذ کی اطلاع پوری طرح ہم نہیں پہنچاتے۔

ان حالات کی روشنی میں میں نے دو ماخذوں پر بھروسہ کیا ہے۔

۱۔ ہتو رام جو اس ریجن میں اُردو کا پہلا تاریخ نویس ہے۔ جس نے کم و بیش اخوند زادہ محمد صدیق کی کتاب سے مواد فراہم کیا ہے۔ وہ کتاب ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ فارسی میں تحریر کردہ "تاریخ بلوچستان" جو ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں لکھی گئی اور میر محراب خاں دوم تک کے حالات پر مشتمل ہے۔

۲۔ مرزا احمد علی کی خوانین قلات کے بارے میں فارسی میں غیر مطبوعہ کتاب جو خداداد کے زمانہ تک کے حالات پر روشنی ڈالتی ہے[1]۔

کہا جاتا ہے کہ میر قمبرانی نے سب سے پہلے منگول حکمرانوں کے ساتھ مخلصانہ تعلقات استوار کیے، اور ان کی خاموش رضامندی یا حقیقی کمک کے ساتھ جاٹوں کو ان کے ضلع جھالاوان میں سے خانہ بدر کر دیا۔ اس کے بیٹے میر عمر کو قندھار کے آرغونوں کا مقابلہ کرنا پڑا (نصیر صفحات ۱۶، ۱۷۔ صالح محمد، صفحہ ۲۸)۔

جب ۱۵۲۲ء میں بابر نے قندھار کو فتح کر لیا تو شاہ بیگ آرغون نے بالائی سندھ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ بعد میں اس کے بیٹے اور جانشین شاہ حسن آرغون نے زیریں سندھ کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا۔ اکبر ۱۵۹۲ء میں سندھ اور بلوچستان کو مکمل طور پر اپنے قبضۂ اختیار میں لے آیا[2]۔ آرغونوں کے پیشگی قبضہ کی وجہ سے میر عمر نے قلات کو اپنے زیر اثر کر لیا جس کے مقدر میں تھا کہ وہ براہوئیوں کی مملکت کی شاہ رگ کی حیثیت سے کام کرے۔ اس کی فتح نے مکرانی بلوچ سرداروں کے حسد کو ابھار دیا۔ میر شاہک رند

۱۔ یہ اقتباسات ہتو رام کی کتاب کے ترتیب دار ۴۳ اور ۶۰ صفحات کو اپنے دائرہ میں لیے ہوئے ہیں اور عملی طور پر ۱۸۹۲ء تک تمام احمد زئی تاریخ کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

۲۔ ایلفنسٹون: ہسٹری آف انڈیا (ترتیب دہندہ ای۔ بی۔ کوویل ایڈیشن نمبر ۹۔ ۱۹۱۱ فٹ نوٹ صفحہ ۴۲۰ از ترتیب دہندہ)۔

اس کا بیٹا میر چاکر رند اور میر گہرام لشاری قلات پر پل پڑے۔ میر عمر تہ تیغ ہو گیا اور اس کی بیوی مہ ناز نے اپنے معصوم بیٹے میر بجار کے ہمراہ مستونگ کے خواجہ خیلوں کے ہاں پناہ لی۔ کچھ عرصہ بعد ان فاتحین نے جو شہری حکومت کے بارے میں اختراعی قابلیت سے عاری تھے کچھی کی طرف رُخ کیا۔ جہاں کی آب و ہوا بہتر تھی، اور ان کی تاخت و تاراج کے لیے وسیع میدان موجود تھا۔ انھوں نے قلات میں میر چاکر کے خسر میر مندو کو رہنے دیا لیکن وہ جلدی ہی ایک براہوئی سے مغلوب ہو گیا جو میر بجار کی تدبیر کا نتیجہ تھا۔[1] جاٹوں نے اسی وقفہ کے دوران اپنے مقبوضات کو دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔ میر بجار نے ان کو تین لڑائیوں میں شکست دی۔ حتیٰ کہ انھوں نے اپنا بہت سا علاقہ اس کے حوالے کر دیا جو میر نے قبیلوں میں تقسیم کر دیا۔ چونکہ میر بوڑھا ہو رہا تھا اس لیے مکہ معظمہ حج کے لیے چلا گیا اور واپسی پر جیسا کہ روایت بتاتی ہے وہ تخت سے قبائلی سرداروں کے حق میں دستبردار ہو گیا جن کو اپنے اپنے علاقہ میں مکمل اختیارات مل گئے۔[2]

اب مغلوں کی فتوحات ہندو پاکستان کی مغربی سرحدوں تک پہنچ چکی تھیں۔ مغلوں نے قلات کو فتح کیا۔ لیکن اُن کا قبضہ اس دور دراز پہاڑی علاقہ میں مستحکم نہ تھا۔ اس لیے قبائلی سرداروں کے اختیارات کی طنابیں ڈھیلی چھوڑ دی گئیں۔ خان کی بجائے مغل گورنر متعین ہوا۔ اسے روایت لطف آفرینی کے باعث "دست برداری" کے نام سے پکارتی ہے۔ جب قندھار مغلوں کے قبضۂ اختیار میں نہ رہا تو اس علاقے میں ان کا اقتدار کم ہو گیا، اور براہوئی میر ابراہیم خاں میروانی، ارباب شمس الدین اور گہرام دہواری کی سرکردگی میں شاہی گورنر کے خلاف متحد ہو گئے۔ یوں مغلوں کی دو نسلوں کی حکومت کے بعد براہویوں نے دوبارہ قلات کو حاصل کر لیا۔ اور حکومت گہرام کے بیٹے اور میر ابراہیم کے بہنوئی میر حسن کے سپرد کر دی گئی۔ یہ یقیناً ۱۶۵۰ء کے آغاز میں

۱۔ اخوندزادہ محمد صدیق۔ ہتو رام نے صفحہ ۱۷۹ پر حوالہ دیا۔

۲۔ نصیر جلد اوّل، صفحہ ۲۸

شاہجہاں کے دورِ سلطنت میں وقوع پذیر ہوا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن کو شاہی ادعائے کوئی سروکار نہ تھا اور بہلول لودھی کی طرح اپنے ہم مرتبہ لوگوں میں برتری پر مطمئن تھا۔ مغلوں کی دوسری جنگی مصروفیات اور صفویوں کے انحطاط نے براہویوں کو قریباً سولہ سال تک کے لیے امن کا وقفہ عطا کر دیا۔ جس میں انھوں نے اپنے نقصان کی تلافی کر لی۔

۱۶۶۶ء میں میر حسن کی وفات پر میر احمد خاں اوّل قمبرانی کو خان منتخب کیا گیا۔ وہ جوان، بہادر اور محنتی تھا اور ایک ریاست کی تراش خراش کے لیے اپنی لیاقت کو منفعت بخش انداز میں استعمال کر سکتا تھا۔ براہویوں کی ریاست کا دورِ آزادی اسی سے شروع ہوتا ہے۔ میر احمد ہی کے زمانے سے تاریخ قلات ایک واضح اور قطعی صورت کا روپ دھارتی ہے۔ اور تاریخ وار سلسلۂ واقعات متعین کیے جا سکتے ہیں۔ میروانی یا میرواڑی خاندان جو میر عمر کے بعد اس نام سے مشہور ہوا، احمدزئیوں کے سامنے جھک گیا جو اس وقت سے حکمران خانوادہ ہے۔ نصیر (جلد اوّل ص ۳۰۲) کے الفاظ میں "میر احمد پہلا حکمران تھا جس نے قلات پر بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کی۔ وہ اپنے عہدِ حکومت میں بارو زئی افغانوں، سندھ کے کلہوڑوں اور مغلوں سے برسرِ پیکار رہا۔ اور اپنی سلطنت کی حدود وسیع کیں۔ اس نے انتہائی جری ہونے کے باعث اپنے قبائلیوں میں نئی روح پھونک دی اور ان میں اقتدار کا شوق پیدا کر دیا۔ اس نے انھیں جنگی طریقوں کے بارے میں تربیت دی اور اپنی موت سے قبل ان کی ایک درخشندہ مستقبل کی طرف رہنمائی کی۔"

میر احمد خاں اوّل شہنشاہ عالمگیر کا ہم عصر تھا۔ میر اس معاملہ میں خاصا عقل مند نظر آتا ہے کہ وہ شہنشاہ کا حلیف بن گیا اور ضلع سبّی کے بارو زئی پٹھانوں کے ساتھ آزادی سے نبٹ سکتا تھا۔ وہ تقریباً اٹھارہ مرتبہ ان کے ساتھ نبرد آزما ہوا اور پندرہ دفعہ شکست کھا گیا۔ اس سے اس کی بہن مائی بیبو اس قدر برہم ہوئی کہ اگلی مہم کی رہنمائی اس نے خود کی اور مار دی گئی۔ آخری دو جھڑپوں میں وہ مکمل طور پر بارو زئیوں پر غالب آ گیا اور درۂ مولا اور چاکو وغیرہ کو فتح کر لیا۔ نیز

کوئٹہ پشین کو بھی اپنے تحت لے آیا"[1]

میر محراب خاں اوّل مغلوں کا حامی تھا چنانچہ وہ داؤد محمد اور نور محمد سندھ کے کلہوڑوں کے ساتھ دست و گریبان رہا جو مغل اقتدار کا تمسخر اڑاتے تھے۔ آخرکار وہ اپنی فوج کی جانب سے ہی ایک گولی کا نشانہ بنا۔ اگرچہ کلہوڑے شکست کھا گئے اور ان کے دونوں رہنما گرفتار ہوئے"[2]

میر سمندر نے کلہوڑہ سرداروں کو دوبارہ گرفتار کیا جو قید سے بچ نکلے تھے۔ لیکن بعد میں وزیر اخوند صالح محمد کی سفارش پر چالیس ہزار روپے کے خراج کے عوض ان کو معاف کر دیا گیا۔ مغلوں نے ان خدمات کو خوب سراہا اور کلہوڑوں کی ایک بندرگاہ کراچی میر کو میر محراب خاں اوّل کی موت کے بدلہ میں عطا کر دی۔ علاوہ ازیں ایک لاکھ روپیہ نقد انعام بھی عنایت کیا۔ میر سمندر نے ایرانی جرنیل طہماسپ بیگ کو پسپا کیا جس نے مغربی بلوچستان کو ایران میں شامل کرنے کی کوشش کی تھی۔ نہ صرف پسپا کیا بلکہ جرنیل کو مار ڈالا جس کے عوض میں مغلوں نے اسے دو لاکھ روپے کی سالانہ پنشن سے نوازا ــــ میر احمد دوم سخی باز اور داد باش تھا۔ اسے جلدی مغلوب کر لیا گیا اور وہ اپنے چھوٹے بھائی میر عبداللہ خاں کے ہاتھوں تہ تیغ ہوا۔ میر عبداللہ خاں جو روایت کے مطابق قہار خاں مشہور تھا، شاہانہ تحکم کا مالک جانباز اور اولوالعزم تھا اس نے شمال مشرق کی طرف کچھی، ہڑنڈ، اور داجل، جنوب مغرب کی جانب بجگور، کیچ اور بندر عباس۔ شمال مغرب کی طرف پشین اور شوراوک کو فتح کیا۔ آخری فتح میں وہ قندھار کے شاہ حسین غلجی (۲۵-۳۸ ۱۷ء) سے الجھ پڑا۔ شاہ حسین نے کلہوڑوں کے ساتھ مشترکہ محاذ قائم کر لیا جنھیں کچھی کی شکست نشتر کی طرح ٹیس پہنچا رہی تھی۔ ان ملی جلی فوجوں نے کوئٹہ کی طرف پیش قدمی کی۔ لیکن موسم سرما کی آمد نے

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہتو رام، صفحات ۱۸۰، ۱۸۱

۲۔ ہتو رام، ص ۱۸۲

کلہوڑوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا اور وہ قبائلیوں کے ہاتھوں خاصی تعداد میں مارے گئے۔ خلجی تہنارہ گیا اور اسے بھی عظیم نقصان اٹھانا پڑا۔ کلہوڑوں کو سبق سکھانے کے لیے خان ان پر حملہ آور ہوا۔ اس نے ڈھاڈر کو فتح کیا اور کچھی کا رخ کیا۔ لیکن مارا گیا اور براہوئی فوجوں کو شکست ہو گئی۔(۱)

میر مہابت نحیف الجثہ انسان تھا۔ تاہم اس نے اپنے اقتدار کا سکہ سرداروں پر بٹھانا چاہا۔ جنھوں نے میر لشکری رئیسانی کے تحت علم بغاوت بلند کیا اور اس کے بھائی میر ایلتاز کو مسند پر بٹھا دیا۔

میر ایلتاز نے بھی اپنے آپ کو سرداری کے لیے ضروری اوصاف کا مالک ثابت نہ کیا۔ اس لیے سرداروں نے میر مہابت کو دوبارہ مسند نشین کرایا۔ جسے بعد میں نادر شاہ کی خوشنودی بھی حاصل ہو گئی۔(۲) تاہم میر ایلتاز مستونگ کے گرد و نواح میں قدرے اقتدار کا مالک رہا۔

اسی اثنا میں نادر شاہ افشار کا تابناک عروج ۱۷۲۲ء میں شروع ہوا۔ جب کہ اسے شاہ طہماسپ دوم (۱۷۲۲ - ۳۲ء) نے کرچی باشی (محکمہ ذخائر حربی یا توپ خانہ کا مالک) مقرر کیا۔ شاہ طہماسپ کا ستارہ جلدی ہی اپنے غلام کے ہاتھوں غروب ہو گیا، اور اس کا معصوم بیٹا عباس سوم تخت نشین ہوا۔ ۱۷۳۶ء میں عباس کی موت پر نادر جو بالواسطہ حکمران تھا ایران کا براہِ راست حاکم بن گیا۔ نادر شاہ نے غلزئیوں کو شکست دی جنھوں نے ۱۷۰۹ء سے اپنے پاؤں ایران میں جما لیے تھے۔ ان کے آخری حکمران اشرف شاہ (۱۷۲۵ - ۲۹ء) کا نہایت سختی سے تعاقب کیا گیا۔ حتیٰ کہ وہ قندھار کے حاکم

۱۔ ہتورام، ص ۱۸۴ تا ۱۸۷۔ مرزا قلیچ بیگ فریدوں بیگ "ہسٹری آف سندھ" ص ۱۴۶، ۱۴۷، ریورٹی (Raverty) نوٹس آن افغانستان اینڈ پارٹ آف بلوچستان، ص ۶۱۰، ۶۱۱

۲۔ ہتورام، ص ۱۸۸

حسین سلطان غلزئی کے سپاہیوں کے ہاتھ آگیا۔ اس نے اسے اپنے بھائی شاہ محمود (جو ۱۷۲۲ تا ۱۷۲۵ء ایران کا تیسرا غلزئی حکمران تھا) کے قتل کے بدلہ میں مروا دیا[1]۔ اس نے عثمانیوں کو بھی تین دفعہ شکست دی۔ یہاں تک کہ انھوں نے بغداد تک کے مقبوضات اس کے حوالے کر دیے۔ پھر اس کا رخ مشرق کی جانب ہوا جہاں ابدالی قندھار کے حسین سلطان کے ساتھ مل کر بغاوت کرتے تھے۔ ابدالیوں پر حملہ کیا گیا اور عبداللہ خاں براہوئی کو نادر خاں نے کہا کہ وہ جنوب سے حسین سلطان پر حملہ کرے تاکہ وہ ابدالیوں کو کمک نہ پہنچا سکے۔ لیکن خان اس پر عمل پیرا نہ ہو سکا کیونکہ وہ کلہوڑوں کے ساتھ برسرپیکار تھا اور اسی لڑائی میں وہ مارا گیا[2]۔ بہرحال ابدالیوں اور غلزئیوں کو شکست ہوئی اور ۱۷۳۲ء میں ہرات فتح کر لیا گیا۔ ۱۷۳۶ء میں نادر شاہ نے حسین سلطان کا قلع قمع کرنے کے لیے چڑھائی کی۔ اور ہرات کے بیگلر بیگ پیر محمد اور اسیلماس خاں عرف خان جان کو میر مہابت خاں اور میر ایلتاز خاں کی سرکوبی کے روانہ کیا، جو آزاد اور سرکش ہو گئے تھے۔ میر مہابت خاں کی فوج شکست کھا گئی اور دونوں جرنیل کوئٹہ روانہ ہوئے جہاں سے انھوں نے قلات پر دباؤ ڈالا۔ براہوئی فوجوں کو دوسری بار ہزیمت ہوئی اور خان مستونگ میں قلعہ بند ہو گیا۔ بعد میں ایلتاز کے مشورہ سے ہتھیار ڈال دیے۔ دونوں بھائی قندھار چلے گئے اور نادر خاں کے مطیع ہو گئے۔ جس نے میر مہابت خاں کو اپنی ملازمت میں لے لیا اور بلوچستان کا گورنر تعینات کیا۔ کم و بیش تین ماہ تک براہویوں کے خلاف فوجی نقل و حرکت ہوتی رہی حتیٰ کہ سارا بلوچستان اس طوفان کے سامنے جھک گیا[3]۔ قندھار بھی فتح ہو گیا، اور ۱۷۳۹ء میں نادر نے دہلی کو فتح کیا۔ انحطاط پذیر مغل سلطنت کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ نادر ۷۰ کروڑ نقد اور ہیرے جواہرات پر قابض ہوا اور سندھ

۱۔ ڈاکٹر ایل لاک ہرٹ نے اپنی کتاب 'نادر شاہ' (مطبوعہ لنڈن ۱۹۳۸) میں حتمی طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ اشرف شاہ کو میر عبداللہ کی بجائے غلزئیوں نے مارا تھا (بمطابق ص ۴۵)، ہنتورام بھی اسی نظریہ کا مدعی ہے۔

۲۔ ایضاً، ص ۵۲

۳۔ نادر شاہ، ص ۱۱۷

کے مغربی مقبوضات یعنی تبت اور کشمیر سے لے کر کراچی تک وسیع علاقہ بھی اپنے قبضۂ اختیار میں لایا۔[1] بعد ازاں میاں نور محمد کلہوڑا کو شکست دی اور اس سے ایک کروڑ کی مالیت کا سامان حاصل کیا۔ تاہم ۱۷۴۰ء میں اسے کچھ علاقہ کی حکومت پر بحال کر دیا۔ کچھی کا علاقہ میر مہابت خاں کو میر عبداللہ خاں کے خون بہا میں دیدیا۔ جو نادر شاہ کے ساتھ حلیف کی حیثیت سے ماتحت رہنے پر مجبور تھا۔[2] اس لیے نصیر کی اس رائے سے اتفاق کرنا ممکن نہیں کہ میر مہابت خاں نے نادر شاہ کے سامنے اپنے آپ کو عبرت ناک حد تک جھکا دیا تھا۔ اور اس نے سب سے پہلے بلوچستان کے دروازے بیرونی سیاسی اقتدار اعلیٰ کے لیے وا کیے تھے۔[3] مطیع ہونے سے پہلے وہ بڑی بہادری سے دو لڑائیاں لڑا تھا جب کہ اس کا باپ بھی نادر شاہ کے مقابلے کی جرأت نہ کر سکا تھا۔ بہر حال ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد اس کے سرداروں کے مابین کشیدگی پیدا ہو گئی۔ احمد شاہ ابدالی افغانستان میں نادر شاہ کا جانشین اور اس کا پہلا قومی بادشاہ بنا۔ اور قلات پر حکومت کرنے کے لیے نادر شاہ کا قانونی وارث بھی وہی ہوا۔ احمد شاہ نے میر مہابت کو معزول کر دیا اور اس کے سب سے چھوٹے بھائی میر نصیر خاں کو گدی پر بٹھا دیا۔[4] جو کہ ۱۷۴۷ء سے نادری کیمپ میں یرغمال کے طور پر تھا اور نادر شاہ کے قتل کے بعد احمد شاہ کے پاس چلا گیا تھا۔

میر نصیر خاں اوّل قلات کا سب سے ممتاز حکمران تھا۔ اس نے براہوئی وفاق کی بنا ڈالی، جو براہویوں، براہویوں سے متاثر شدہ قبائل اور غیر براہوئی بلوچوں اور جاٹوں پر جن کو براہویوں کے برابر سمجھا جاتا اور جنھوں نے اپنی زبان و تہذیب کو برقرار رکھا تھا مشتمل تھا۔ جب سے براہوئی ریاست معرضِ وجود میں آئی تھی وہاں مرکزی حیثیت کا کوئی مقام نہ تھا لیکن شہریت کے حقوق کی حد تک چار باتوں کی سختی سے

۱۔ نادر شاہ، ص ۱۵۳

۲۔ ایضاً، ص ۱۵۷ تا ۱۶۱

۳۔ نصیر، جلد اوّل، ص ۷۸، ۷۹

۴۔ ہتو رام، ص ۱۹۱، ۱۹۲

پابندی کی جاتی تھی۔ ملک سے وفاداری، زبان سے وفاداری، تہذیب سے وفاداری اور ریاست کی مدافعانہ اور جارحانہ حکمت عملی سے وفاداری۔ یہ وفاداریاں ایک دوسری سے مربوط تھیں اور ان سب کو مکمل طور پر ماننا پڑتا تھا۔ قدرتی طور پر یہ وفاداریاں ان لوگوں سے جو ریاست کی حد میں آنا چاہتے تھے کچھ زیادہ کی خواست گار تھیں، اور یہ مطالبے ریاست کی وسعت میں مزاحمت کا باعث بن جاتے تھے۔ میر نصیر خاں نے اسے محسوس کیا اور ان میں تخفیف کر کے رعایت سے کام لیا جس کی وجہ سے وہ زیادہ سے زیادہ حد ملک ریاست میں توسیع کرنے کے قابل ہو سکا۔ اور یکساں طور پر براہوئیوں اور بلوچوں میں مقبول ہو گیا۔ ضلع کچھی میں اس نے رند، مگسی اور ڈومبکی بلوچ قبیلوں کو ملک کے ساتھ وفادار رہنے کے صلے میں اجازت دے دی کہ وہ اپنی املاک پر قابض رہیں اور زبان و تہذیب کو برقرار رکھیں۔ اس طرح اس کی ریاست زیادہ وسیع بنیادوں پر قائم ہو گئی اور اس وقت سے کچھی کے بلوچ ریاست کا ایک اہم حصہ بن گئے۔

اس کے بعد نصیر خاں نے فوجی تنظیم کی طرف توجہ کی اور اپنی فوج تین حصوں میں تقسیم کر دی۔ دستۂ خاص یا دستۂ خان جو ۱۷۵۰ فوجیوں پر مشتمل تھا۔ دستۂ ساراوان جس میں ۵۱۶۰ سپاہی تھے۔[1] اور دستۂ جھالاوان جو ۵۰۰۰ جنگجوؤں سے عبارت تھا۔[2] دستۂ خان کے سپاہی آٹھ قبیلوں سے بھرتی کیے جاتے اور براہ راست خان کے ماتحت تھے۔ ان کا جھنڈا سبز تھا۔ اعلیٰ جنگی ساز و سامان سے لیس تھے اور ان کی رہائش کا انتظام بھی بہترین تھا۔ ساراوان ڈویژن میں ۱۰ قبیلوں کے سپاہی تھے جن کا جھنڈا سرخ تھا اور اس کا سردار رئیسانی ان کا کمانڈر تھا۔ جھالاوان ڈویژن تیرہ قبائل سے بنایا جاتا تھا۔ اس کا جھنڈا زرد ہوتا اور سردار زرکزئی کمانداری کے فرائض ادا کرتا۔ لڑائی کے دوران خان کا ڈویژن قلب میں رہتا اور دوسرے ڈویژن میمنہ اور میسرہ کی حیثیت اختیار کرتے تھے۔ ڈویژن کا کمانڈر "سرِ سرداراں" کہلاتا تھا جس کی امداد سردار کرتے تھے، اور ان کے احکام بریگیڈ کمانڈر بجالاتے تھے۔ مثلاً دستۂ ساراوان

۱۔ ساراوان ڈسٹرکٹ گزیٹیئر ضمیمہ نمبر ۲

۲۔ جھالاوان ڈسٹرکٹ گزیٹیئر ضمیمہ نمبر ۳

سرِ سرداراں سردار رئیسانی کے تحت تین بریگیڈوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ رئیسانی بریگیڈ، شاہوانی بریگیڈ اور منگلزئی بریگیڈ۔ یہ بریگیڈ رجمنٹوں میں منقسم ہوتے مثلاً رئیسانی بریگیڈ میں رئیسانی، کرد، لانگھ اور ساتکزئی رجمنٹیں ہوتیں۔ سرِ سرداراں ہمارے میجر جنرل یا لفٹننٹ جنرل کے مماثل سردار ہمارے بریگیڈیئر اور ٹکری کرنل کے برابر ہوتے تھے۔ رجمنٹیں کمپنیوں (پرا) اور یونٹوں (شلوار) میں منتقل ہوتی تھیں اور علی الترتیب معتبروں اور سفید پوشوں کے تابع ہوتیں۔ اس طرح فوجی افسروں کا باقاعدہ ایک سلسلہ قائم کیا گیا تھا۔ خان کو جو اختیارات اپنے ڈویژن پر حاصل تھے وہی سرِ سرداران کو اپنے بریگیڈ پر تھے۔ سفید پوش معتبر کے، معتبر ٹکری کے، ٹکری سردار کے، اور سردار سرِ سرداراں کے سامنے جوابدہ تھے۔ اور دونوں خان کے حضور میں ذمہ دار سمجھے جاتے۔ لہٰذا خان کو صرف دو انسانوں سے واسطہ پڑتا۔ جب کہ سرِ سرداراں رئیسانی کو دس سرداروں، اور سرِ سرداراں زرکزئی کو تیرہ سرداروں سے نپٹنا پڑتا تھا۔ یہ سلسلہ سفید پوش تک پہنچ جاتا جو ایک یونٹ کا انچارج ہوتا۔

یہ طریقِ کار جس کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے بظاہر مغلوں کے منصبداری نظام سے اخذ کیا گیا تھا، جو خود منگولوں کے اشاری نظام کی اصلاح یافتہ صورت تھی جس کی توضیح (ایچ۔ ایچ۔ ہوورتھ نے اپنی کتاب ہسٹری آف دی منگولز میں کی ہے، ص ۱۰۸، ۱۰۹)۔

ہر قبیلہ میں سے جتنے سپاہیوں کی ضرورت ہوتی اسے غمِ لشکر کہتے۔ جن کے اخراجات غمی اراضیات سے برداشت کیے جاتے جن کو خان نے اس مقصد کے لیے مختص کر دیا تھا۔ خان کے ڈویژن کے علاوہ ہر ڈویژن کے غمِ لشکر کے بارہویں حصّے کو دارالحکومت میں رہنا پڑتا۔ یہ 'سرپادشاہ' کہلاتا تھا۔ اس کے بعد فوج کی تعداد کی ترتیب یوں ہو جاتی تھی۔

شاہی ڈویژن	=	۱۲۵۰
سانِ سارا وان	=	۴۳۰
سانِ جھالاوان	=	۴۷۵
میزان	=	۲،۱۵۵

سان کے معنی ہیں لشکر کا وہ حصہ جو مستقل خانِ قلات کے پاس رہتا تھا اور اس کی شان قائم رکھتا تھا!

ہنگامی صورتِ حال کے پیشِ نظر خان اپنی باقاعدہ فوج قریباً تین گنا رکھنے کا مجاز تھا۔ ہتورام بیان کرتا ہے کہ اس کی کل فوجی قوت تقریباً ایک لاکھ تھی۔[1] میر گل خاں نصیر کا کہنا ہے[2] کہ اس کی ساری سلطنت کی آبادی ایک کروڑ یا اس سے کچھ زیادہ تھی۔ اس علاقے کی آبادی کے رجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے معتدل اور زیادہ صحیح اندازہ کم و بیش دو کروڑ کا ہوگا۔ جس میں سے زیادہ سے زیادہ فوجی قوت ایک لاکھ کی ہوگی۔

دیوانی نظامِ حکومت نادر شاہ کے نظام پر استوار کیا گیا تھا جسے نصیر خاں نے کئی سال تک عملی صورت میں دیکھا تھا۔ وزیر دیوانی اور خارجی امور کا ذمہ دار تھا۔ مالیات، جزیہ اور دوسرے متفرق محکموں کی نگرانی و کمیل کرتا تھا۔ دو داروغے کچھی، ساراوان، جھالاوان اور مکران کے نائبین کے کام کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ایک افسر شاہ غاسی نادری اصطلاح میں ایشک آغاسی (حاجب الحجاب) تعینات کیا گیا تھا۔ اس کے ذمہ سرداروں کے رتبہ کے اعتبار سے بیٹھنے کی جگہوں کا بندوبست کرنا، نازک صورتِ حال میں غمِ لشکر کے لیے رسد کا انصرام کرنا، سان پادشاہ کا جائزہ لینا اور دربار میں متعدد دیگر فرائض کو سرانجام دینا تھا۔[3] ابتدائی مسلمان حکومتوں کے ہاں اسی سے ملتا جلتا حاجب ہوتا تھا۔ ان تنخواہ دار سرکاری ملازمین کے علاوہ رفقا کا ایک بورڈ تھا جس کا نام مجلس مصاحبین تھا۔ اس کے پانچ ممبر ہوتے تھے۔ تین امتیازی اور دو سر سرداران۔ یہ خان کی اندرونی مجلس کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ علاوہ ازیں مجلسِ مشاورت یا مجلس شوریٰ قریباً چالیس سرداروں یا اُن کے نمائندوں پر جو دارالحکومت میں ہوتے، مشتمل تھی نصیر خاں کے عہد میں یہ سب سے زیادہ تعداد تھی۔[4] یہ ادارہ انتظامِ سلطنت کا بیرونی حلقہ تھا اور قومی اہمیت کے

۱۔ ہتورام، ص ۲۷۲

۲۔ نصیر (جلد اوّل)، ص ۱۷۴

۳۔ ہتورام، ص ۳۰۳

۴۔ ایضاً، ص ۲۷۱

فیصلے وہیں کیے جاتے تھے۔ عدالتی اختیارات سرداروں کو سونپے گئے جن کی رہنمائی قاضی شریعت کے مطابق کرتے تھے لیکن حرام کاری اور قتل کے بارے میں واضح اور خاص موقعوں پر اس سے انحراف بھی کیا جاتا۔[1] ہندو اقلیت کو مذہب اور پیشہ کے بارے میں آزادی حاصل تھی۔ نصیر خاں ذاتی طور پر بے حد مذہبی تھا اور جہاں کہیں ہو نماز باقاعدگی سے ادا کرتا تھا۔ غالباً خان کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ وہ نئے مقبوضات کا رابطہ اصل سلطنت سے قائم کر سکتا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے اس نے کچھی کے بلوچوں کے دلوں کو موہ لیا۔ لیکن مری بگٹی علاقہ، ہرنڈ، داجل وغیرہ کو کبھی جذب نہ کر سکا۔ مکران میں ذکریوں کے خلاف اس نے نو بار چڑھائی کی۔[2] اور بعض اوقات ان کے بارے میں درشت اور سخت گیر ثابت ہوا۔ شاید اس لیے کہ ذکری فرقہ بھی سکھوں کی طرح مذہبی سیاسی گروہ تھا۔ ذکریوں نے خان کے مقابلہ میں سخت ترین مزاحمت کی۔ خان چونکہ انھیں بدعتی خیال کرتا تھا اس لیے ان کے متعلق بہت سخت رویہ اختیار کیا۔ میر نصیر خاں اول بہت زیادہ سخی تھا۔ وہ براہوئی رعایا کے لیے ایک فرشتہ، اپنے دوستوں کے لیے ایک بے غرض دوست، اپنے دشمنوں کا جانی دشمن اور ان سرداروں کے لیے ایک عذاب تھا جو اس کی آزادی کے مخالف تھے۔ ان خوبیوں کے ساتھ ہی اس میں کچھ خامیاں بھی تھیں جو زیادہ تر حالات زمانہ کی وجہ سے تھیں۔

اس عظیم خاں نے نصف صدی کی حکومت کے دوران میں تقریباً ۲۵ لڑائیاں لڑیں۔ اور اس کی مہمات کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو اس کی اپنی شہنشاہانہ خواہش اقتدار کا نتیجہ تھیں اور جو ماسوا شمالی علاقوں کے موجودہ کوئٹہ و قلات ریجن تک محدود رہیں۔ دوسرے وہ جو اسے اپنے سرپرست احمد شاہ ابدالی اور اس کے جانشین تیمور شاہ کے ساتھ تعاون کے بعد اپنی ریاست کے حدود سے باہر لڑنی پڑیں۔ اس کی فوجی تنظیم ہی ان معرکوں میں کامیابی کی ضامن بنی اور خان اپنے اردگرد سرداروں اور قبائلیوں کو جمع کرنے کے قابل ہوا۔ اس کا مظاہرہ اس وقت ہوا جب ۱۷۵۸ء میں

۱۔ ہنتورام، ص ۲۷۲، ۲۷۳

۲۔ امپیریل گزیٹیئر آف انڈیا، جلد چہ، ص ۲۵۵

احمد شاہ ابدالی کے خلاف اس کی شہنشاہیت کی مزاحمت کے لیے مدافعانہ جنگ لڑی گئی۔
پہلی قسم کی مہموں کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ اپنی فوج کی از سر نو تنظیم کر چکا۔ لس بیلہ، پنجگور کے گچکی، کیچ خاران کے گچکی، مری اور سندھ کے تالپور بلوچ اس سے تصادم کے نتائج کو سمجھ گئے اور اس کی برتری کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ دوسری قسم کی مہموں میں پانی پت کی تیسری لڑائی (۱۷۶۱ء) اور وسطی پنجاب کے سکھوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کی چھ لڑائیوں (۱۷۶۵ء) میں شرکت بہت اہم ہیں۔ واپسی پر تون، طبس کے خان علی مردان پر حملہ کیا اور اسے مار ڈالا۔ ان فتوحات کی قدر و منزلت ظاہر کرنے کے لیے ابدالی نے اسے ہڑنڈ، اور داجل عطا کیے۔ احمد شاہ ابدالی کے جانشین تیمور شاہ کے اشارہ پر اس نے بہاول خاں سے سر تسلیم خم کرایا اور پھر اس کے لیے معافی بھی حاصل کی۔ براہوئی افغان جنگ میں کیچ (مکران) کے گچکیوں کی طرف سے احمد شاہ ابدالی نے مداخلت کی۔ نصیر خاں نے مکرانیوں کو شکست دی اور نتیجتہً ذکری گروہ کا سردار ملک دینار گچکی مارا گیا۔ لیکن اس مداخلت کی وجہ سے خان اپنی فتوحات کا ثمر نہ پا سکا اور شاہی حکم کی تعمیل میں اسے اپنے آپ کو باز رکھنا پڑا۔ اس نے مکران کو اوّلین موقعہ پر زیر کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اسی اثنا میں میر مہابت خاں کے بیٹے میر حاجی خاں نے بغاوت کی لیکن شکست کھا کر قندھار کی طرف بھاگ گیا۔ احمد شاہ ابدالی نے جواب طلبی کی اور خان یہ سمجھا کہ ابدالی اس کے مرتبہ کو نائب السلطنت کے عہدہ تک گھٹا دینا چاہتا ہے۔ اور ان متصل علاقوں کو فتح کرنے کے سلسلے میں جو قلات کے بقا کے لیے نہایت اہم ہیں اس کا مخالف ہے۔ لہذا اس نے پہلی قیود کا خاتمہ کرتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور یہ اعلان کیا کہ وہ شاہ کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت کو برداشت نہیں کرے گا۔ اس کی وجہ سے ابدالی قلات پر حملہ آور ہوا۔ براہویوں نے تین دن تک جان فشانی سے افغانوں کا مقابلہ کیا اور جب ان پر زیادہ دباؤ پڑا تو وہ قلات کے قلعہ میں محصور ہو گئے۔ اس سے ابدالی ششش و پنج میں پڑ گیا کیونکہ وہ بھی نادر شاہ کی طرح محاصرانہ جنگوں میں زیادہ ماہر نہ تھا۔ یہ محاصرہ چالیس دن تک جاری رہا اور تین دفعہ وسیع پیمانہ پر دھاوا بولا گیا لیکن براہویوں نے ہتھیار

نہ ڈالے۔ اسی دوران میں مرہٹوں نے تیمور شاہ کو پنجاب سے دریائے سندھ کی دوسری جانب دھکیل دیا[1]۔ جس سے خان کے متعلق احمد شاہ ابدالی کے رویہ میں تبدیلی رونما ہو گئی۔ ادھر خان کی حالت بھی روز بروز خطرناک صورت اختیار کر رہی تھی۔ چنانچہ شاہ ولی خان بامے زئی اور اخوند محمد حیات کے ذریعہ گفت و شنید شروع ہوئی جس کا نتیجہ ایک معاہدہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس کے مطابق سارا مالیہ اور رسانِ یادشاہ ابدالی کے لیے بند کر دیا گیا۔ خان کو صرف غیر ملکی جنگوں میں ایک رجمنٹ اور امدادی رقم دینے اور اسلحہ وغیرہ کا بندوبست کرنے کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ علاوہ ازیں یہ بھی طے ہوا کہ دونوں ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں دخیل نہ ہوں گے۔ احمد شاہ نے مفتوحہ علاقہ بھی واپس لوٹا دیا اور خان کو بیگلر بیگی کا خطاب دیا۔ اور خان نے اسے حکم فرمایعنی ایسا بادشاہ جو دوسری ریاست پر برائے نام مقتدر تو ہو لیکن اس کے اندرونی معاملات میں دخیل نہ ہو تسلیم کر لیا۔ خان کی بھتیجی کی شادی تیمور شاہ سے ہو گئی جس سے یہ معاہدہ مزید استوار ہو گیا۔ اور اس کے بعد دونوں طاقتوں نے اس معاہدہ کا احترام کیا[2]۔

میر نصیر خان اوّل کی جنگوں کے نتیجہ میں براہوئی ریاست چاروں طرف خاصی پھیل گئی۔ جنوب میں یہ مکران اور لس بیلہ میں ایک برتر قوت بن گئی۔ شمال مغرب میں خاران، چاغی، مستونگ، کوئٹہ اور پشین شامل ہوئے۔ شمال مشرق کی جانب سے مری بگٹی علاقہ، ہڑنڈ اور داجل سے لے کر پنجاب کی سرحد تک کا علاقہ اس کے ساتھ ملحق ہوا۔ اور مشرق میں باغی ضلع کچھی کو ایک مستقل مقبوضہ علاقہ کی شکل دے دی گئی۔ یہ علاقہ براہِ راست خان کے تابع تھا۔ لیکن اس کا سیاسی اور فوجی اثر خراسان میں نون اور طبس اور شمال مشرق میں کشمیر اور دہلی تک میں محسوس کیا جاتا تھا۔ اس بات کو ماننا پڑے گا کہ براہوئی ریاست اس ذہین خان کے عہد میں انتہائی

۱۔ فریزر۔ ٹیلر۔ افغانستان (مطبوعہ لنڈن ۱۹۵۰ء) ص ۶۳

۲۔ ملکم کی تاریخ ایران۔ ترتیب دہندہ لفٹیننٹ کرنل ایم۔ ایچ۔ کورٹ۔ ص ۸۴

عروج پر تھی۔ اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں اگر وہ اس علاقے میں روایتی ہیرو کی حیثیت اختیار کر گیا۔"[1]

میر محمود خاں اوّل میر نصیر خاں کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ وہ صرف سات سال کا بچہ تھا اس لیے اس کا استاد اخوند فتح محمد بحیثیت ولی ایک مجلس کی مدد سے حکومت کرنے لگا۔ لیکن وہ کمزور اور عیش وعشرت کا دلدادہ تھا۔ اس لیے بہت سے نئے شامل شدہ مقبوضات نے بغاوت کی اور اپنی آزادی کے دعوے دار بنے۔ ایلڈرڈ پوٹنگر (Eldred Pottinger) پہلا انگریز سیاح ہے جو اس علاقے میں وارد ہوا۔ اس نے ۱۸۱۰ء میں یہاں بدامنی اور انتشار پایا۔ قبائلی اپنے آپ کو آزاد خیال کرتے تھے۔

میر محراب خاں دوم[2] اپنے باپ کا جانشین بنا۔ اس نے عظیم خان کی طرح بغیر اس کی ہوشیاری اور تحمل کے مستبدانہ روش کو اپنایا۔ نصیر نے بالکل درست کہا ہے کہ "بادل کی مثل گرجتے ہوئے وہ صرف شبنم کے قطروں کی طرح برسا۔" مرزا احمد علی کے الفاظ میں محراب خاں ایک بہادر اور غضب ناک شخص تھا۔ بیدار مغز اور ہوشیار حکمران کا شیوہ یہ ہے کہ وہ انتظامی امور کو عقل و تدبّر سے سرانجام دیتا ہے۔ رعایا کے ساتھ نرمی اور مہربانی سے پیش آتا اور اپنا ممنون کرم بنا لیتا ہے۔ تندی اور درشتی سے حکومت کے کام ہرگز سدھر نہیں سکتے۔ لیکن محراب خاں نے اس کے برعکس لوگوں کا خون بہانا شروع کر دیا۔"[3] سارا وان کا سردار

۱۔ ہتورام بحوالہ اخوندزادہ، ص ۱۹۲ تا ۲۰۱۔ اے ڈبلیو ہیوگز، کنٹری آف بلوچستان، ص ۱۸۸، ۱۸۹

۲۔ ہتورام، ص ۲۰۸ تا ۲۳

۳۔ ایضاً، ص ۲۲۷، ۲۲۸ " محراب خاں شخصے شجاع و غضب ناک بود۔ شیوۂ حاکمان بیدار مغز و ہوشیار آنست کہ بنائے کار برا عقل و تدبیر میگزارند مردم را بالطف و مہربانی از خود مشکور و ممنون میدارند۔ بہ تندی و درشتی کار حکومت ہرگز راست نمی آید۔ محراب خاں بخلاف آں بنائے مردم کشی را در جہاں نہاد۔"

مہراللہ خاں رئیسانی اور جھالاوان کا سردار قادر بخش زہری جو کہ سب سے زیادہ ذی اثر سردار تھے موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ خان خود بر ور معتمدین اور مشیرانِ کار کے ہاتھوں کٹ پتلی بنا رہا۔ جن میں اخوند فتح محمد افغان، اس کا لڑکا مُلا محمد حسن، مُلا عبدالرحمٰن ایرانی، داؤد محمد غلجی قندھار کے اخوند صالح محمد اور اس کا بیٹا اخوند محمد صدیق اور سید محمد شریف شامل تھے۔ ان کاسہ لیسوں نے براہوئی ریاست میں تباہی مچا دی۔ انہی سیاق و سباق میں براہوئی ریاست انگریزوں اور افغانوں میں شدید کشیدگی کے بھنور میں آ پھنسی جس کا نتیجہ جنگ افغان (۱۸۳۷-۳۹) کی صورت میں رونما ہوا۔

تاریخ تصوّف

مصنّف: بشیر احمد ڈار

" ظہورِ اسلام سے قبل مختلف معاشروں میں تصوّف کا جو تصوّر رہا ہے، یا مختلف ممالک و مذاہب سے متعلق مفکروں نے تصوف کے بارے میں جن افکار و نظریات کا اظہار کیا ہے، زیر نظر کتاب میں ان سے بحث کی گئی ہے۔ . . . تصوّف سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب خاصی معلومات افزا ثابت ہو گی۔"

—— روزنامہ امروز۔ لاہور

قیمت ۲۵/۴ روپے

ملنے کا پتہ

سکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور